ڈاکٹر روبینہ ترین

# جامعات میں تدریسِ تواریخ ادب ___ تقاضے اور تجاویز

## Objectives of Teaching History of Literature in Universities: Needs and Suggestions

**Dr. Rubina Tareen**, Chairperson, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan.

**Abstract:**

While writing the history of literature, giving importance to basic and fundamental principles is quite necessary but it is more important that in our universities the objectives of teaching history of literature should be clear and lucid. Geographical and historical information be projected in the classroom while teaching history of language and literature. Critical sense of the teacher may inculcate a sense of history in the students, who may distinguish between the history and historicity. In this article, these questions have been raised and some answers and suggestions have also been presented.

اب تک لکھی گئی اُردو ادب کی تواریخ پر نظر ڈالیں تو اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ مکمل، مختصر، علاقائی اور مختلف اصناف کے ارتقاء کے حوالے سے بہت سی تواریخ ہندوستان اور پاکستان میں لکھی گئی ہیں۔[1] مستشرقین کا کام ان سے سوا ہے لیکن ان کے طریق کار، ان سے فراہم شدہ معلومات اور سب سے بڑھ کر اُردو ادب کا جائزہ لینے کا رویہ کم و بیش شخصی ہے۔ اس سلسلے کی ضخیم اور نمائندہ مثال ڈاکٹر گیان چند جین کی ''اُردو کی ادبی تاریخیں'' (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو کراچی، ۲۰۰۰ء) ہے۔ جس میں اتنے بڑے محقق نے اُن عالموں کے لیے ممنونیت کا اظہار کیا ہے اور اُن کی تواریخ ادب کی فروگزاشتوں سے درگذر کیا ہے۔ جنھوں نے اُنھیں مواد فراہم کیا تھا۔ پاکستان اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ یہاں نہ صرف پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ ادب اُردو کے ایک بہت بڑے ریسرچ پراجیکٹ (تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند)

پر کام کیا' جو مدیرانِ کرام کے مابین عدم ارتباط اور اس یونیورسٹی میں کارفرما باہمی حسد و چپقلش کے سبب علمی حلقوں میں نا معتبر ٹھہرا، اس کے برعکس ڈاکٹر محمد صادق کی "A History of Urdu Literature" اور "20th Century Literature" کو ملک کے مقتدر طبقات میں پذیرائی حاصل رہی ، اس کے علاوہ ڈاکٹر سلیم اختر،[۲] ڈاکٹر انور سدید،[۳] ڈاکٹر ملک حسن اختر،[۴] اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اُردو ادب کی مختصر تواریخ (ڈاکٹر اعجاز حسین اور احتشام حسین کی طرح) لکھیں بلکہ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے اب تک اٹھائیس (۲۸) ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

اب تک پاکستان میں اُردو ادب کے بارے میں محنت، تحقیق اور تجزیے کے حوالے سے جو معیاری تواریخ لکھی گئی ہیں وہ میرے نزدیک دو ہیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی 'اُردو ادب کی تاریخ' جو ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک کے عرصے پر محیط ہے آج کل ڈاکٹر تبسم کاشمیری بڑی محنت اور عرق ریزی سے اُس کی دوسری جلد مکمل کرنے میں مصروف ہیں جب کہ دوسری بڑی اہم تاریخ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہے جو اب تک تین جلدوں میں سامنے آ چکی ہے تاہم وہ بھی کم وبیش اٹھارویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف حصے تک لکھی گئی ہے ۔(دُعا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی 'تاریخ اُردو ادب' کے مشن کو مکمل کر سکیں) ۲۰۰۷ء کے دوران ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ۱۵۰ برس مکمل ہونے تک پاک و بھارت میں بہت سے بین الاقوامی سیمینار ہوئے ان میں نئی تاریخی دستاویزات اور شہادتوں پر بھی بحث ہوئی اور تاریخ ادب اُردو سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھی تحقیق کے نئے در وا ہوئے سب سے بڑھ کر یہ کہ اب تاریخی حقائق اور تاریخی جائزے کے لیے دستاویزات سے بنیادی معلومات تلاش کرنے کے لیے درج ذیل ذرائع کی جانب زیادہ توجہ دی گئی۔

۱۔ جس زمانے کی تاریخ لکھی جائے اُن زمانے کے ہندوستانیوں کی جانب سے لکھے گئے روز نامچے، مکاتیب اور یادداشتیں۔

۲۔ انگریزوں کے لکھے ہوئے روز نامچے یا یادداشتیں۔

۳۔ عدالتی ریکارڈ، جس میں مقدمے اور ان کے فیصلے شامل ہیں۔

۴۔ خفیہ ایجنسیوں کا ریکارڈ جن کے حوالے سے اجتماعی منظر نامے کے اہم وقوع کے تمام پہلو سامنے آ رہے ہیں۔

۵۔ وقتی مصالح سے آزاد ہو کر تاریخی و تنقیدی شعور سے کام لے کر نتائج اخذ کیے جائیں۔

آج اس حوالے سے بحث جاری ہے کہ تاریخ ادب کیسے لکھی جائے یا اس میں کن پہلوؤں کو اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

اس بارے میں مختلف نقطۂ نظر سامنے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا اصرار ہے کہ معلومات اور کوائف اہم ہیں تنقیدی شعور اہم نہیں۔ شخصیات، واقعات، اصناف، ادوار اور سنین اہم ہیں۔[۵]

جب کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا نقطہ نظر ہے کہ تنقیدی شعور کے بغیر تاریخی شعور ممکن نہیں۔ اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ادبی مورخ کو محقق سے زیادہ نقاد ہونا چاہیے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ادبی مورخ کی تنقید کمزور ہے تو وہ کبھی بھی اچھی تاریخ ادب نہ لکھ سکے گا۔ ادبی تاریخ میں جو چیز بہت اہم ہے وہ کسی عہد، کسی ادیب، کسی شاعر، کسی نظریے یا رجحان کا تنقیدی محاکمہ ہے۔ یہ تنقید ہی ہے جو کسی بھی مصنف کے ادبی مقام کا تعین کرتی ہے۔ تنقید ہی کسی فن پارے کے محاسن، معائب اور تجزیے کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ اگر تاریخ ادب میں ان پہلوؤں پر توجہ نہ دی جائے یا اچھے تجزیے پیش نہ کر سکیں تو پھر ادبی تاریخ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔''[۶]

ڈاکٹر معین الدین عقیل کی توجہ اس بات پر ہے کہ معیاری تاریخ ادب، تاریخ اور تحقیق کے معیاری نتائج، تحقیق و تجزیے کے بغیر ممکن نہیں ان کے نزدیک خود تنقید بھی، اپنی نوعیت کے لحاظ سے، تحقیقی عمل کے بغیر شاید معیاری نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر تذکرہ نویسی اور تاریخ نویسی میں تنقید، تحقیق اور تجزیے کا فرق بہت واضح ہے اور تاریخ نویسی میں تاریخی و تہذیبی شعور اور معاشرتی احساس وہ بنیادی لوازمات ہیں جو تاریخ نویسی کو تذکرہ نویسی سے ممتاز کرتے ہیں۔ لیکن یوں دیکھیے تو ہماری تاریخ نویسی کی ابتدائی تقریباً تمام مثالیں تذکرہ نویسی کے اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ سکسینہ کی تاریخ اپنی نوعیت، اپنے مباحث اور اپنے دور تک ایک نسبتاً بہتر اور مکمل تاریخ تھی۔ اس سے قبل اور ''آب حیات'' کے بعد معلومات کے لحاظ سے متعدد تصانیف اس ذیل میں لکھی جا چکی تھیں لیکن وہ نوعیت کے اعتبار سے یا علاقائی جائزوں تک محدود تھیں یا صنفی ارتقاء کے مطالعے کے لیے مخصوص تھیں اور نظم اور نثر دونوں میں سے کسی ایک پر مرکوز رہتی تھیں۔ ان مؤرخین میں یہ

خیال عام رہا کہ وہ سب کچھ جو ادبی تخلیقی سرگرمیوں کے نام پر لکھا جاتا رہا، ان سب کا ذکر تاریخ کا موضوع ہے اور اس لیے سارے ہی دستیاب کام اور نام، جو چاہے شاعروں کے ہوں یا نثر نگاروں کے، یہاں تک کہ کسی بھی موضوع پر جو کچھ لکھا گیا، جیسے مذہبی موضوعات، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، مناظرے، تاریخ اور صحافتی سرگرمیاں، صحافیوں کی خدمات، علمی و تعلیمی اداروں، انجمنوں کی سرگرمیاں، سب ہی ادب کی تاریخ کے موضوعات بنتے رہے ہیں۔ ۷

اب تک جتنی بھی تاریخِ ادب لکھی گئی ہیں سب میں ہندستان میں اُردو زبان وادب کے آغاز میں مسلم مقتدر قوتوں کے تال میل کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُردو زبان بننے کے عمل میں جن علاقوں، حکومتوں اور عوامل کا ذکر کیا جاتا ہے اُن میں بھی اسلامی ثقافت کو فعال کردار ادا کرتے دکھایا گیا ہے۔ جب کہ تقسیم ہند کے بعد ماہرین لسانیات یا مورخین سب کی تحریروں پر اس تاریخی واقعے کے اثرات نمایاں ہیں اور اکھنڈ ثقافت اور اُس کے مقابل دوقومی نظریے کی صداقت ثابت کرنے کے لیے بالعموم جذباتی اسلوب ملتا ہے، بیچ میں اُردو میں مرکزی دینی روایت کی تقلید کی بات ہوئی تو پھر پاکستان میں بھی اس حوالے سے اختلافِ رائے سامنے آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک جو تواریخ لکھی گئیں اُن سب نے زبان وادب کی ارتقاء اور تاریخ کو جنوبی وشمالی ہند کی آویزش سے بھی وابستہ کیا جب کہ اُس زمانے میں برصغیر کے کسی اور حصے میں اس زبان میں ادب تخلیق کرنے والوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ عموماً اقتدار کے مراکز میں تخلیق ہونے والے ادب پر ہی مورخین ادب کی نظر پڑتی ہے۔ اور شاید اسی انداز کے تغافل کا شکار جنوبی پنجاب بھی رہا ہے۔ انھوں نے اُردو کے ابتدائی تخلیقی جملے تلاش کرتے ہوئے اُچ اور ملتان کے اُن صوفیاء کو نظر انداز کر دیا ہے کہ جن کا تعلق دکن کے صوفیاء کے خانوادے سے بھی تھا اور جنوبی پنجاب کے ان علاقوں میں اِن کی رہائش تھی اور اس علاقے کو انھوں نے اپنی تبلیغ کا مرکز بھی بنایا۔

اب تک اُردو ادب کی جتنی تاریخیں لکھی گئیں، اُن کا طریقِ کار عموماً یکساں ہے۔ ابتدائی حصہ میں اُردو کی ابتداء اور ماخذات کے بارے میں جو مختلف نقطۂ ہائے نظر ہیں ان کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور پھر اٹھارویں صدی عیسوی کو اہم موڑ سمجھ کر اُس سے قبل کی شاعری اور نثر کا جائزہ لے کر اُردو شعر ادب کا ابتدائی مرکز جنوبی ہند کو قرار دیا جا رہا ہے۔ شاعری کے حوالے

سے تو بیشتر مورخینِ ادب متفق ہیں کہ دکن میں اُس نے ابتدائی نشوونما مراحل طے کیے اور اِس میں صوفیا کرام نے عوامی سطح پر اور دوسرے شعراء نے دربار میں رہ کر سلاطین کی خوشنودی کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاعری کی اور اس دور کی تمام تر شاعری ہند مسلم کلچر کا مشترک اظہار ہے۔ یوں کم وبیش ڈیڑھ سو برس کے ابتدائی وارتقائی مراحل طے کرنے میں جنوبی ہند کے علاقے کو مرکز قرار دیا گیا۔ جب کہ نثر میں صورتحال اس سے مختلف ہے۔ اُردو کا پہلا نثر نگار کون ہے؟ اس بارے میں مختلف شہادتیں ہیں۔ حامد حسن قادری نے کچھوچھہ شریف کی خانقاہ میں موجود ملفوظات کے حوالے سے اشرف جہانگیر سمنانی کے ''رسالہ تصوف'' کو اُردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا۔[8] مولوی عبدالحق اور دوسرے مورخین جن میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل ہیں، نے خواجہ بندہ نواز گیسودراز (۱۳۲۰-۱۴۲۲ء) کی تصنیف ''معراج العاشقین'' (۹۰۶ھ) کو پہلی باقاعدہ نثری تصنیف قرار دیتے ہوئے از سرنو مرتب کر کے شایع کیا۔[9] ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مولوی عبدالحق کی تحقیق پر اعتراض کیا اور معراج العاشقین کو اُردو کی پہلی کتاب تسلیم نہیں کیا اور اُس نام کے رسالے کا مصنف شاہ مخدوم حسینی بلکا نوری کو بتایا۔[10] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے بھی مولوی عبدالحق کی تحقیق نظر انداز کرتے ہوئے اس سے بھی پہلے کی دو تصانیف 'رسالہ شاہ راجو' اور 'رسالہ جنونیہ' کا ذکر کیا۔[11] جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کے بیان کی تائید کی ہے۔[12] ڈاکٹر حفیظ قتیل کی اس بات کی تائید ڈاکٹر سیدہ جعفر نے دکنی نثر کا انتخاب کرتے ہوئے اس طرح کی:

> ''اس انتخاب میں ابتداء اس لیے برہان الدین جانم کی تحریروں سے کی گئی ہے کہ وہی دکن کے پہلے مصنف تھے اور تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی کی نثری کاوش ہے، جو گیارہویں صدی کے آخر اور بارہویں صدی کے اوائل کے مصنف تھے۔ خود مخدوم شاہ حسینی کی تلاوت الوجود کا انتخاب بھی اس کتاب میں شامل ہے۔''[13]

ان سب محققین ومورخین نے اپنی اپنی تحقیق کے سلسلہ میں دلائل دیئے اور اپنی دریافت کی ہوئی کتب سے نمونہ کے طور پر عبارتیں بھی دیں لیکن یہ شہادتیں تحقیقی نقطۂ نظر سے

زیادہ معتبر نہیں ۱۴؎ اس لیے کہ ان میں سے بیشتر کتب کا تعلق صوفیاء کرام سے ہے ان کے بارے میں عام تاثر ہے کہ وہ خود لکھنا نہیں جانتے تھے ان کے عقیدت مندوں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کی بتائی ہوئی باتوں کو مریدین قلم بند کر لیں، اسی لیے اُن ملفوظات کو بعد میں اُن کے کسی مرید نے اپنے زمانے کی مروج زبان میں لکھ دیا ویسے بھی اشاعت کی سہولت نہ ہونے کے باعث ایک نسخے سے دوسرا نسخہ تیار کرتے ہوئے کاتب اس میں ترمیم واضافہ کو فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے جس سے اُردو کی ابتدائی تصنیف کے حوالے سے شکوک وشبہات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اُردو ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے مورخین نے فورٹ ولیم کالج (جولائی ۱۸۰۰ء) سے قبل کے نثری کارناموں کا ذکر اختصار سے کیا ہے بلکہ ان کی تعداد کے بارے میں بھی اُن کے مابین اتفاق نہیں 'اُردوئے قدیم' میں حکیم شمس اللہ قادری نے گیارہ 'تاریخ ادبِ اُردو' میں رام بابو سکسینہ نے نو 'تاریخ نثر اُردو' میں احسن مارہروی نے دس اور حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں تقریباً پچیس کتب کا ذکر کیا ہے۔ البتہ اس بات سے سب متفق ہیں کہ اپنے منفرد طرزِ اسلوب کے اعتبار سے ملا وجہی کی تصنیف ''سب رس'' (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے الفاظ کے اس قدر ذخیرہ اور زبان پر عبور کے باعث ایک ہی بات کو کئی طریقے سے واضح کرنے کی کوشش کی۔ تصوف کے دقیق مسائل کی تشریح کے لیے مانوس عربی، فارسی اصطلاحیں استعمال کیں اندازِ بیان کے حسن میں اضافہ اُردو فارسی اور ہندی الفاظ کو شیر وشکر کر کے نئی نئی ترکیبیں بنانے کے فن سے کیا، چناں چہ گیارہویں صدی عیسوی تک اُردو نثر کی زبان کا جائزہ لینے کے لیے 'سب رس' کو ہی اہم سمجھا گیا حالانکہ اس سے پہلے خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف ''معراج العاشقین''، برہان الدین جانم کی ''کلمتہ الحقائق'' اور امین الدین اعلیٰ کے ''رسائل کلمتہ الاسرار''، ''ارشاد نامہ'' سامنے آ چکے تھے۔ اس حقیقت سے بھی سب واقف ہیں کہ بلحاظِ زبان اور بلحاظِ اسلوب اُردو نثر کا شاہ کار ''سب رس'' کی صورت میں ہے۔ چناں چہ ہماری بیشتر جامعات میں ایم اے اُردو کے نصاب میں اس کتاب کے منتخب حصے شامل کئے گئے لیکن اس کی تدریس پر مامور استاد کے لیے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ وہ قدیم دکنی زبان کو سمجھ سکے یا طالب علموں کے اندر اس کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرے۔ اس کے لیے ایسی لغت کی ضرورت ہے کہ جس کی مدد سے آج کا طالب علم اس کا مطالعہ بھی کر سکے اور

لطف اندوز بھی ہو سکے۔ جب کہ شاعری کے لیے شمالی ہند کو اہم سمجھا گیا اور عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ جنوب اور شمال کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی سب واقف ہیں کہ جو زبان گجرات سے جنوب کی طرف وقفے وقفے سے پہنچی اس میں سرکاری عمال، افواج کے علاوہ صوفیاء کے قافلے بھی شامل ہیں اور جنوب کی ریاستیں کبھی شمال کا حصہ رہیں اور کبھی انھوں نے خودمختار حیثیت اختیار کر لی۔ خودمختاری کے اظہار کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ فارسی سے رشتہ ختم ہو جائے لیکن ایسا کرنا مشکل تھا اس لیے کہ اس نئی زبان میں علاقائی مزاج کے باوجود اصناف جوں کی توں فارسی سے آئی ہیں مثنوی، مرثیہ، غزل، قصیدہ سب اصناف کو اسی طرح شعراء نے اپنے تجربات میں استعمال کیا۔ البتہ فارسی کلچر ساتھ لانے کے باوجود دکن کی مقامی زبانوں کے لسانی اثرات اسی علاقے میں بننے والی اُردو پر پڑے اور ابتدائی سطح پر سب سے زیادہ شعروادب بھی اسی علاقے میں نہ صرف تخلیق ہوا بلکہ دستیاب بھی ہے۔

ہماری جامعات کے نصاب میں عام طور پر تاریخ ادب، نثر، شاعری، تنقید اور اقبالیات کے لازمی پرچوں کی تدریس کے علاوہ کچھ اختیاری مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جنھیں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بنیادی نصاب سے الگ کوئی مضمون ہیں اور اس میں طالب علم واستاد دونوں کی دل چسپی واجبی ہوتی ہے جب کہ لازمی پرچوں کی تدریس پر انحصار کیا جاتا ہے انھی لازمی پرچوں میں چاہے تاریخ ادب ہو یا نثر یا کلاسکی شاعری کی تدریس ہر جگہ اُردو ادب کے قدیم سرمائے کا ایک حصہ اس طرح شامل کیا جاتا ہے کہ جس سے نہ صرف زبان وادب بلکہ اس عہد کے سیاسی، تاریخی ومعاشرتی حالات کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے اس مقصد کے لیے ہماری تاریخ ادب کی کتابیں ایک ہی طرح کے معلومات ومواد کو مختلف اسلوب کے ساتھ پیش کرتی ہیں کہ ان میں مزید تحقیق کی گنجائش کے حوالے سے اب تک سمجھا گیا کہ مزید کچھ نہیں ہے اور خصوصاً آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی ہجری تک کے تخلیق کردہ ادب کے محدود حصوں کو اتنا مشکل بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُردو کے علاوہ کوئی اور زبان ہے۔ خصوصاً دکنی زبان کے بارے میں تاثر ہے کہ وہ ذہن جو جدید اُردو کی صفائی، دلکشی اور بلاغت سے آشنا ہے وہ نامانوس دکنی کو اُردو کے مسلمہ محاورے سے پرکھتا ہے ان کے نزدیک معیاری اُردو زبان شمالی ہند کی زبان ہے۔ یہاں ڈاکٹر م۔ ن سعید کی یہ رائے قابل غور ہے کہ:

''دکنی کی تدریس کے سلسلے میں ایک ایسے بندھے ٹکے رویے سے ہم نے مصالحت کر لی ہے کہ جس کی رو سے وہ 'سب رس' ہو یا 'قطب مشتری'، 'پھول بن' ہو یا 'مینا ستونتی'، 'علی نامہ' ہو یا 'قصۂ چندر بدن و مہیار' سب لسانیات کا کچا مال ہیں۔ سب کتابوں کے بعد ممتحن کی ٹکسال میں ڈھلا ہوا ISI کا مہر شدہ ایک ہی سوال حاضر ہے کہ سب رس/ قطب مشتری/ پھول بن/ مینا ستونتی/ یا فلاں/ یا فلاں کی لسانی خصوصیات لکھیے اور یہ خصوصیات سہیل بخاری کی 'سب رس پر ایک نظر' کے علاوہ غلط یا صحیح بہت مل جاتی ہیں اور اس تصدیق کی ضرورت بھی نہیں کہ جس کتاب کی لسانی خصوصیات لکھی جا رہی ہیں ان میں سے آدھی بھی اُس میں ہیں یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کئی دہوں سے لسانی خصوصیات کی ایک لاٹھی سے پورے دکنی ادب کو ہانکنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔''[۱۴]

آج کے دور میں جب تاریخ ادب کے حوالے سے تحقیق کی جا رہی ہے تو ابھی تک ابتداء سے اب تک مجموعی تاریخ ادب کا جائزہ تحریکوں یا مختلف نمایاں رجحانات کی شکل میں لیا جا رہا ہے جب کہ قدیم ادب کی کتب کی تدوین کا کام بھی علیحدہ سے کیا جا رہا ہے اور اس میں ٹیکسٹ کے ساتھ ساتھ کوشش کی جا رہی ہے کہ مشکل یا غیر مانوس الفاظ کی فرہنگ بنا دی جائے ساتھ ہی مصنف اور اس کے عہد کے حالات کو منظر عام پر لایا جائے اس سلسلے میں خصوصاً دکن، شمالی ہند اور لکھنو سے تخلیق کردہ ادب ہمارے محققین اور مورخین ادب کی توجہ کا مرکز ہیں جب کہ برصغیر کے وہ علاقے جہاں اُردو کی ابتداء کی وجوہات کے شواہد پیش کئے جاتے ہیں انھیں اب بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہماری نوجوان نسل جو اُردو ادب سے وابستہ ہے وہ انھی محدود کتب و نظریات کو ہی تاریخ ادب اُردو سمجھتی ہے۔ جب کہ وادیٔ سندھ کے حوالے سے قدیم لٹریچر سامنے آ رہا ہے۔ عربی، سنسکرت، فارسی اور بنگالی کے قدیم لٹریچر کو کھنگالا جا رہا ہے۔ اُردو چوں کہ ابتدائی طور پر ان زبانوں کے لٹریچر سے متاثر رہی ہے۔ یہاں تک کہ ابتدائی اُردو زبان میں بھی انھی زبانوں سے استفادہ کیا گیا۔ نہ صرف زبان کے اعتبار سے بلکہ اصناف بھی متاثر رہی ہیں یہاں تک کہ قصہ کہانیاں بھی انھی زبانوں کے ادب سے ماخوذ تھیں۔ اس لیے اُردو کے اسکالر کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدیم اُردو لٹریچر کا مطالعہ کر رہا ہے تو وہ اُن زبانوں کے لٹریچر کے پس منظر کے بارے میں بھی علم رکھتا ہو۔ یہی صورت حال کسی حد تک تاریخ ادب کے لکھنے والے مورخین کے تنقیدی شعور اور تجزیے کی صلاحیت میں بھی شامل ہو تو معیاری تاریخ ادب لکھی جا سکتی ہے۔

تاریخ ادب کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ اسے چند علاقوں تک محدود کرنا یا اس میں منتخب شعراء اور نثر نگاروں کے بارے میں لکھنا کافی نہیں تاریخ ادب کے نیم روشن گوشوں سے پردہ اٹھانا بھی ضروری ہے۔ جس زمانے میں جنوبی وشمالی ہند میں اُردو ادب کے ارتقاء کا جائزہ لیا جاتا ہے اُسی زمانے میں برصغیر کے دیگر علاقوں میں جو اُردو ادب تخلیق ہو رہا تھا اُسے نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ لکھنے والا بچل سرمست کے اُردو کلام کو کیوں نظر انداز کرتا ہے؟ جب کہ وہ دہلی اور لکھنو کے ذوالسان شعراء کا ذکر کرتے ہیں۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر' مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ملتان اور اُچ کے علاقے میں رہے خواجہ غلام فرید بھی پانچ زبانوں پر مہارت رکھتے تھے اور اس علاقے کے بڑے صوفی شاعر تھے لیکن یہ حوالہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی کے ملتان کے شاعر عبدالرحمٰن کی 'سندیس راسک' کا ذکر ابھی تک ہماری تواریخ ادب میں نہیں کیا گیا حالانکہ قدامت میں وہ دکن میں تخلیق پانے والی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ ہمارے مؤرخین ادب اور محققین کو قدیم اُردو ادب کا سرمایہ زیادہ تر جنوبی وشمالی ہند کے ذاتی کتب خانوں سے دستیاب ہوا اور انھوں نے اسی کو تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ تاریخ ادب اُردو کا ایک حصہ بنا دیا۔

میرے نزدیک تاریخ ادب کو پڑھانے کے لیے اس میں دل چسپی پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تدریس ایسے اساتذہ کریں جو اس خطے کی تاریخ اور جغرافیے کے ساتھ لسانیات سے بھی وقف ہوں۔ چوں کہ اُردو کی تاریخ کا آغاز سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر عہد کے ادب کو اُس کے سیاسی سماجی اور معاشی پس منظر میں دیکھا جائے۔ انفرادی طور پر شخصیات کے فکر وفن کو تاریخ کا حصہ بنانے سے زیادہ مجموعی طور پر اس عہد کے تناظر میں ادبی تارخ کا تجزیہ زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ اُس وقت زبان کا املاء اور الفاظ ایسے نہیں تھے جو آج ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لیے آسان اور معلومات پر مشتمل لغت سے استفادے کا طریق کار، استاد کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ طالب علموں کو سمجھا سکے اور طالب علموں کو بھی ان لغات سے استفادے کا طریقہ کار بتائیں۔

موضوع میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے پرانے نقشوں کی مدد سے اُردو کی ابتدائی مراکز کے بارے میں طالب علموں کو سمجھایا جائے اور قدیم الفاظ کے املاء اور مفہوم سے متعلق سلائیڈ دکھائی جائے اور اُن سے متعلق تفصیلات کو بھی دل چسپ بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ دکن، راس کماری یا مختلف علاقوں کا ذکر تو کیا جاتا ہے جب کہ خود استاد بھی ان سے واقف نہیں ہوتا بعض اوقات مورخ بھی مختلف کتب سے حاصل کردہ معلومات کو ہی کافی تصور کرتا ہے اس طرح اس کے اندر تجزیہ کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

سنہ ہجری اور سنہ عیسوی کے فرق کو سمجھانا ضروری ہے یا کم از کم طالب علموں کو اس سے استفادے کا طریق کار سمجھایا جائے۔ سنہ ہجری اور سنہ عیسوی درج کرتے ہوئے عموماً خیال نہیں رکھا جاتا ہماری تاریخوں میں قدیم ادب کا حوالہ سنہ ہجری سے اور تقریباً اٹھارویں صدی عیسوی شروع ہوتے ہی سنہ ہجری کہیں پس منظر میں چلا جاتا ہے چناں چہ تاریخ ادب کے مطالعے میں قاری بھی بعض اوقات الجھ کر رہ جاتا ہے۔ مورخ کے ساتھ ساتھ استاد کے لیے بھی ضروری ہے کہ اپنے طالب علم کو اس فرق کو سمجھنے کے لیے لغات اور قدیم املا سے استفادے کے طریق کار سمجھائے۔

## حوالے


۱۔ سلمان احمد: ''ادبی تاریخیں: نظری مباحث''، حیدرآباد، قصر الادب، ۱۹۹۹ء۔
۲۔ ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگِ میل پبلشرز، لاہور ۲۰۰۵ء۔
۳۔ ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء۔
۴۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، ''تاریخ ادب اُردو''، یونیورسل بکس، لاہور۔
۵۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: 'اُردو کی ادبی تاریخیں'، از ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اُردو کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷-۳۲۔
۶۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ''ادبی تاریخ کی تشکیلِ نو کے مسائل'' مشمولہ تخلیقی ادب، شمارہ ۵، نمل، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۔
۷۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ''ادبی تاریخ نویسی: صورتحال اور تقاضے'' مشمولہ بازیافت، شمارہ ۱۰، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۔
۸۔ حامد حسن قادری، ''داستان تاریخ اُردو''، لکشمی نارائن اگروال، آگرہ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۷۔
۹۔ ڈاکٹر عبدالحق، مولوی، ''معراج العاشقین'' (مقدمہ)، اورنگ آباد، دکن، ص ۶۔
۱۰۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل، ''معراج العاشقین''، نیشنل پرنٹنگ پریس، چارکمان، بارِ اول ۱۹۶۸ء ص ۲۳۔

۱۱؎ 'اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء (انیسویں صدی کے اوائل تک)، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، کریم سنز پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۷۸ء، ص ۸۶-۸۷۔

۱۲؎ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اُردو'' جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص ۱۵۹-۱۶۰۔

۱۳؎ سیدہ جعفر، ''دکنی نثر کا انتخاب''، ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۳ء، ص ۶۔

۱۴؎ جامعات میں دکنی کی تدریس، مشمولہ فکر و تحقیق (دکنی ادب نمبر مرتبہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم)، جلد ا، شمارہ ا، جنوری تا جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۰۔

۱۵؎ تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کیجیے: ''تحقیق''، جام شورو، شمارہ ۱۰۔۱۱، ص ۸۶۲ تا ۸۶۹۔

## کتابیات


۱۔ انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد ''مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اُردو''، جلد اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۱ء۔

۳۔ حفیظ قتیل، ڈاکٹر: ''معراج العاشقین''، طبع اوّل، چارکمان، نیشنل پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۸ء۔

۴۔ رضیہ سلطانہ، ڈاکٹر: ''اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء (انیسویں صدی کے اوائل تک)''، کراچی، کریم سنز پبلی کیشن، ۱۹۷۸ء۔

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگِ میل پبلشرز، ۲۰۰۵ء۔

۶۔ سیدہ جعفر: ''دکنی نثر کا انتخاب''، دکن، ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۳ء۔

۷۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: ''معراج العاشقین''، دکن اورنگ آباد۔

۸۔ قادری، حامد حسن: ''داستان تاریخ اُردو''، آگرہ لکشمی نارائن اگروال، ۱۹۵۷ء۔

۹۔ گیان چند، ڈاکٹر: ''اُردو کی ادبی تاریخیں''، کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۱ء۔

۱۰۔ ملک حسن اختر: ''تاریخ ادب اُردو''، لاہور، یونیورسل بکس۔


## رسائل


۱۔ بازیافت، اسلام آباد، شمارہ ۱۰، ۲۰۰۸ء۔

۲۔ تخلیقی ادب، اسلام آباد، شمارہ ۵، ۲۰۰۸ء۔

۳۔ فکر و تحقیق، دکنی ادب نمبر، شمارہ ا، جنوری تا جون ۱۹۸۹ء۔


o < ------ > o